جِس نے اُمید کے بیج بوئے

مصنف: جین جی اونو

ہندی ترجمہ: اروِند گُپتا

اُردو ترجمہ: محمد زبیر

جِس نے اُمید کے بیج بوئے

جین جی اونو

کسی آدمی کی اِنسانیت کا سہی اندازہ لگانے کے لئے اُسے ایک لمبی عمر تک جانچنا پرکھنا ضروری ہے۔ اگر کوئی اجر کی خواہش کئے بغیر دُوسروں کی بھلائی میں لگا ہو تو اُس سے اچھا اور کیا ہو سکتا ہے۔ جِس اِنسان کی کہانی میں آپ کو سُنانے جا رہا ہوں اُس نے تو اپنی محنت اور لگن سے اِس زمین کی تصویر ہی بدل ڈالی

بات دراصل کافی پُرانی ہے۔ آج سے تقریباً چالیس سال پہلے میں فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ سال بھر کی ٹریننگ کے بعد مجھے پندرہ دِنوں کی چُھٹی ملی تھی۔ چُھٹی پر گھر جانے کی بجائے میں نے آوارہ گری کی سوچی۔ اپنے فوجی تھیلے میں کُچھ کھانے کا سامان اور کپانی کی بوتل رکھ کر میں سیر کو نکل پڑا جس علاقے سے میں گُزر رہا تھا اُسے میں پہلے سے نہیں جانتا تھا۔ زمین ایک دم بنجر تھی۔ کہیں کہیں پیلے دھتُورے کی کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ باقی جنگل سوکھی گھاس کے علاوہ اور کُچھ نہیں اُگا رہا تھا۔

مجھے اب اِس علاقے میں چلتے چلتے دو دِن ہو گئے تھے۔ یہ علاقہ کافی ویران تھا اور ماحول میں بھی ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جہاں میں اب کھڑا تھا وہاں شاید کبھی گاؤں رہا ہو گا۔ ایک جھُرمٹ میں چھ سات مکان تھے جو اب کھنڈر میں بدل گئے تھے۔ اِنہیں دیکھ کر مُجھے لگا کہ آس پاس کوئی کنواں یا پانی کا ذریعہ ضرور ہو گا۔ تھوڑا ڈھونڈنے پر ایک نالہ دِکھائی بھی دیا۔ پر وہ بھی اب سُوکھ گیا تھا۔ میں نے وہاں پر کُچھ دیر آرام کرنے کی سوچی۔ میرا پانی ختم ہو گیا تھا اور پیاس سے میرا چٹخ رہا تھا۔ گاؤں کے ایک کونے میں ایک ٹوٹا مندر بھی دِکھائی دِیا۔ پر وہاں اب کوئی نہیں رہتا تھا۔

جون کا مہینہ تھا۔ سورج کی گرمی سے زمین تپ رہی تھی۔ تیز ہوا کے جھوکے دُھول کے بگولے اُڑا رہے تھے۔ اِس اُداسی بھرے ماحول میں زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکا۔ میں نے ایک پگڈنڈی پکڑی اور آگے بڑھا۔

پانچ گھنٹے چلتے رہنے کے بعد بھی مجھے کہیں بھی پانی نہیں ملا۔ اب تو میں پانی کے اُمید بھی کھو بیٹھا تھا۔ میرے چاروں طرف سُوکھی مٹی میں اُگی کانٹے دار جھاڑیوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ اِس سناٹے میں مجھے دور ایک کالی پرچھائی نظر آئی۔ مجھے دور سے وہ کسی درخت جیسا لگا اور میں اُس طرف چل پڑا۔ پاس پہنچ کر وہ ایک گڈریا نکلا۔ اُس کے آس پاس پکّی مٹی میں تیس بھیڑیں تھیں۔

اُس نے لوکی کی تُمبی میں سے مجھے پانی پلایا اور کُچھ دیر بعد وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہ ایک گہرے قدرتی کنویں میں سے پانی کھینچتا تھا۔ اِتنی گہرائی سے پانی کھینچنے کے لئے اُس نے دھرنیوں اور رسیوں کی ایک جُگاڑ بنائی تھی۔

وہ آدمی بہت کم بولتا تھا۔ ایسا شاید اِس لئے تھا کیونکہ وہ ایک دم اکیلا رہتا تھا اور اُس کے ساتھ بولنے والا کوئی نہیں تھا۔ پر اُس کی خود اعتمادی کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے کام میں مُستعد ہو۔ اِس سُنسان بنجر علاقے میں مجھے اُس سے ملنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ وہ باقاعدہ ایک پکّے مکان میں رہتا تھا، جِس سے اُس نے آس پاس کے پتھروں سے کھود کر بنایا تھا۔ گھر کی چھت مضبوط تھی۔ چھت سے ہوا ٹکرا کر سائیں سائیں کر رہی تھی۔

گھر میں سبھی چیزیں قاعدے قرینے سے رکھی تھیں۔ برتن دُھلے تھے اور فرش صاف سُتھرا تھا۔ ایک کونے میں دھار دار کلہاڑی رکھی تھی۔ چُلہے کی دھیمی آگ پر پتیلی چڑھی تھی جِس میں کھِچڑی پک رہی تھی۔ اُس نے اِتنی مہارت سے اپنے کوٹ پر پیوند لگایا تھا کہ وہ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اُس نے کھِچڑی مجھے بھی کھِلائی۔ کھانے کے بعد میں نے سگریٹ جلائی اور ایک اُس بھی دی۔ اُس نے کہا کہ وہ سگریٹ نہیں پیتا۔ اُس کے پاس ایک کُتا تھا لیکن وہ بھی اپنے مالک کی طرح ہی چُپ چاپ رہتا تھا۔

پہلی مُلاقات کے بعد ہی مجھے ایسا لگا جیسے رات کو ٹھہرنے کی منظوری اُس نے مجھے دے دی ہو۔ کیونکہ اگلا گاؤں قریب ڈیڑھ دِن کی دُوری پر تھا، اِسی لئے یہ اچھا تھا کہ میں اپنے تھکے پیروں کو کُچھ آرام دُوں۔ اِس پہاڑی علاقے میں دور دراز پر کئی چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں۔ بستیاں آپس میں کچی سڑک سے جُڑی تھیں۔ اِن بستیوں میں رہنے والے لکڑی سے کوئلہ بنانے کا کام کرتے تھے۔

کوئلے کے کام کی وجہ سے آس پاس کے سبھی درخت کٹ چکے تھے۔ بے رحم ہوا کو روکنے ٹوکنے والا کوئی درخت نہیں بچا تھا۔ ٹیلوں پر ہر دم دُھول بھری آندھی ناچا کرتی۔ کوئلے کے کام میں کوئی زیادہ فایدہ نہیں تھا۔ کوئلے کو گاڑی سے شہر تک لے جاتے ہوئے دو دِن لگ جاتے تھے۔ بدلے میں دلال جو پیسہ دیتے تھے اُس سے مُشکل سے خرچ نکل پاتا تھا۔ قرض، بیماری اور بنجر زمین کی وجہ سے کوئلے کا کام کرنے والے خاندان بھی اذیت کی وجہ سے مر رہے تھے۔

کھانے کے بعد گڈریئے نے ایک چھوٹا تھیلا اُٹھایا اور اُس کے سارے بیج میز پر ڈال دیئے۔ پھر وہ بہت توجہ سے اُن کا معائنہ

کرنے لگا۔ وہ ایک ایک بیج کو اُٹھاتا، اُسے غور سے دیکھتا اور بعد میں اُن میں سے اچھے بیج کو ایک طرف چھانٹ کر رکھ دیتا۔ میں نے سگریٹ کا ایک کش کھینچا اور سوچا کہ میں بیج چھانٹنے کے کام میں گڈریئے کی کُچھ مدد کروں۔ لیکن اُس نے کہا کہ یہ کام وہ خود ہی کرے گا۔ اور جس لگان اور یکسُوئی سے وہ اپنا کام کر رہا تھا اُسے دیکھ کر مجھے اپنی دخل اندازی ٹھیک بھی نہیں لگی۔ ہم لوگوں کے درمیان بہت تھوڑی بات چیت ہوئی تھی۔ بیجوں کو چھانٹنے نے بعد وہ اُس میں سے اچھے بیجوں کی دس دس کی ڈھیری بنانے لگا۔ ڈھیری بناتے وقت وہ بیجوں کا بہت باریکی سے معائنہ کرتا۔

اُس میں سے تھوڑے بھی داغ دار چٹخے ہوئے بیجوں کہ وہ الگ رکھ دیتا۔ اِس طرح سے اُس نے سو اچھے بیج چھانٹے، اُس کو ایک تھیلے میں بھرا اور سونے چلا گیا۔

نہ جانے کیوں اِس اِنسان کے ساتھ مجھے بڑے سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ اگلے دِن صبح میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا میں اُس کے یہاں ایک دِن اور آرام کر سکتا ہوں۔ اُس نے آسانی سے اِس کی اجازت دے دی۔ اُس کے بعد وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اب آگے اور کُچھ بات چیت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پر میرے اندر بے چینی جاگ رہی تھی اور میں اُس گڈریئے کی آپ بیتی جاننے کو بے چین تھا۔

سب سے پہلے اُس نے اُن چھانٹے ہوئے بیجوں کو ایک پانی کے برتن میں بھگویا دیا۔ پھر اُس نے بھیڑوں کی باڑ کھولی اور اُنہیں چراگاہ کی طرف لے چلا۔ میں نے دیکھا کہ گڈریئے کے ہاتھ میں لکڑی کی بجائے ایک پانچ فُٹ لمبی لوہے کی چھڑ تھی۔ چھڑ میرے انگوٹھے جتنی موٹی ہو گی۔ میں بھی چُپکے چُپکے گڈریئے کے پیچھے ہو لیا۔ بھیڑوں کی چارہ گاہ نیچے گھاٹی میں تھی۔ تھوڑی دیر بعد بھیڑوں کو اپنے کُتے کی دیکھ بھال میں چھوڑ کر وہ خود آہستہ آہستہ پہاڑی پر میری طرف بڑھا۔ مُجھے لگا کہ وہ میری اِس دخل اندازی پر بوکھلائے گا۔ لیکن اُس نے ایسا کُچھ نہیں کیا۔ وہ اپنے راستے چلا اور کیونکہ میرے پاس اور کُچھ کرنے کو نہیں تھا۔ اِس لئے میں بھی اپس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ لگ بھگ سو گز کے فاصلے پر ایک ٹیلے پر چڑھا۔

وہاں پر اُس نے لوہے کی چھڑ سے مٹی کو کھود کر ایک گڑھا بنایا۔ اِس مُس اُس نے ایک بیج بویا اور پھر سوراخ کو مٹی سے بھر دیا۔ وہ دیسی پیڑوں کے بیج بو رہا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا وہ زمین اُس کی اپنی جائیداد ہے۔ اُسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ زمین کِس کی ہے۔ شائد وہ گاؤں کی مشترک زمین ہو، یا پھر کُچھ ایسے رئیسوں کی جنہیں اِس زمین کی کُچھ پرواہ ہی نہ ہو۔ زمین کا مالک کون ہے یہ جاننے میں اُسے کوئی دِلچسپی نہیں تھی۔ اُس نے اُن سو بیجوں کہ بہت پیار اور محبت کے ساتھ بو دیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد وہ بیج بونے کے اپنے کام میں دوبارہ مصروف ہو گیا۔ میں نے شائد اپنا سوال بار بار دوہرایا ہو گا، کیونکہ آخر میں مجھے اُس کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات ضرور ملی۔ پچھلے تین سال سے وہ اُس بیابان علاقے میں درختوں کے بیج بو رہا تھا۔ وہ ابھی تھ ایک لاکھ بیج بو چُکا تھا۔ اِس ایک لاکھ بیجوں میں سے صرف 20 ہزار پودے ہی نکلے تھے۔ اُسے لگتا تھا کہ اِن بیس ہزار میں سے آدھے ہی زندہ بچیں گے۔ آدھے یا تو کسی قدرت آفت کا شکار ہو جائیں گے یا پھر اُنہیں چوہے کُتر دیں گے۔ لیکن جہاں پہلے کُچھ بھی نہیں تھا وہاں اب کم سے کم دس ہزار درخت تو اُگ رہے ہیں۔

یہ سب سُننے کے بعد میں اُس اِنسان کی عمر کے بارے میں اندازہ لگانے لگا۔ وہ یقینی طور پر پچاس سال سے اوپر کا ہو گا۔ اُس نے مجھے خود بتایا کہ وہ پچپن سال کا ہے۔ ایک وقت ترائی کے نچلے حصے میں اُس کی کھیتی باڑی تھی۔

لیکن اچانک اُس کے اکلوتے لڑکے اور پھر بیوی کی مو
ت ہو گئی۔ اِس سے اُس کو گہرا صدمہ پہنچا۔ تبھی سے
اکیلا رہنے کے لیے وہ اپنے کُتے اور بھیڑوں کے ساتھ
یہاں چلا آیا۔ اُن کا ماننا تھا کہ درختوں کے بغیر زمین
آہستہ آہستہ مر رہی ہے۔ کیونکہ اُس کے ذمے اور
کوئی ضروری کام نہیں تھا اِس لیے اُس نے زمین کی
اِس خراب حالت تو درست کرنے کی بیڑا اُٹھایا۔
کیونکہ اُس وقت میں نوجوان تھا اوور سیر سپاٹے کے
لیے ایک ویران علاقے میں نکلا تھا، اِس لیے میں اُس
کا درد کُچھ سمجھ پایا۔ میں اُس وقت نادان تھا اور ایک
اچھے خوشحال مستقبل کی راہ تلاش کر رہا تھا۔ مُن نے
اُس سے کہا کہ اگلے تیس سالوں میں اُس کے لگائے
ہوئے یہ دس ہزار درخت ایک گھنے اور خوبصورت
جنگل کی صورت اختیار کر لیں گے۔ اُس نے میرے
سوال کے جواب میں ایک آسان سا جواب دیا۔ اُس
نے کہا کہ اگر خدا نے اُسے لمبی عمر بخشی تو وہ اگلے
تیس سالوں میں اِتنے زیادہ درخت لگائے گا کہ دس ہزار درخت تو سمندر کی ایک بوند جتنے نظر آئیں گے۔
اِس کے علاوہ وہ کچھ پھل دار درختوں کے بیجوں کی کونپلوں کے بارے میں بھی تجربات کر رہا تھا۔ اِس کے لیے اُس نے اپنے گھر
کے باہر ایک تجربہ گاہ بنائی تھی

کُچھ درختوں کو اُس نے کانٹے دار تار لگا کر بھیڑوں سے محفوظ رکھا تھا۔ یہ پودے بہت اچھی طرح بڑھ رہے گے۔ اُس نے نیچے گھاٹی مُس کُچھ اور قسم کے بیج بونے کا منصوبہ بنایا تھا۔ گھاتی کی زمین میں کُچھ گہرائی پر مٹی میں نمی تھی۔ اِسی وجہ سے یہ درخت وہاں اچھی جڑ پکڑتے۔

اگلے دِن میں وہاں سے نکل پڑا۔

اگلے سال 1914 کی پہلی عالمی جنگ شروع ہوگئی۔ میری فوجی کی ٹکڑی اِس جنگ میں پانچ سال تک لڑتی رہی۔ ایک فوجی سپاہی کی حیثیت سے لڑائی کے دوران مجھے درختوں کے بارے میں سوچنے تک کی فرصت نہیں ملی۔ سچ بات تو یہ تھی کہ اُس واقع کا مجھ پر بالکل اثر نہیں ہوا تھا۔ لوگوں کے الگ الگ شوق ہوتے ہیں۔ کُچھ لوگوں ڈاک ٹکٹ اکٹھا کرتے ہیں تو کچھ لوگ مختلف ملکوں کے سِکے۔ کُچھ لوگوں کو شوقیہ طور پر درخت لگانے میں بھی مزہ آتا ہو گا۔ میں اِس واقع کو لگ بھگ بُھول چکا تھا۔

لڑائی ختم ہونے کے بعد مجھے ایک لمبی چھٹی ملی اور ساتھ میں اچھی خاصی رقم بھی ملی۔ میں نے سوچا کیوں کہ سیر سپاٹا کیا جائے اِس خیال سے میں نے ایک دفعہ پھر اُسی ویران علاقے میں آوارہ گردی کے لئے نکل پڑا۔ اُس علاقے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لیکن اُس کھنڈر ہوئے گاؤں میں جب میں پہنچا تو مجھے دور دراز کی پہاڑیوں پر ایک دُھند سی نظر آئی۔ اب جیسے جیسے میں اُس گڈریئے کے گھر کے نزدیک پہنچ رہا تھا اُس کی یاد اُتنی ہی تروتازہ ہوتی جارہی تھی۔ میں دِل میں تمنا کر رہا تھا کہ وہ دس ہزار درخت اب کتنے بڑے ہوگئے ہوں گے۔

میں تمام لوگوں کو جنگ کے دوران مرتے دیکھا تھا۔ اگر کوئی کہتا کہ وہ گڈریا اب مر چُکا ہے تو اِس بات کو ماننے میں مجھے کوئی بھی دِقت نہیں ہوتی ۔ بھلا پچاس ساٹھ سال کا بوڑھا مرنے کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتا ہے۔ پر وہ گڈریا مرا نہیں تھا۔ وہ نہ صرف زندہ تھا بلکہ ایک دم بھلا چنگا تھا۔ اُس کے کام میں تھوری تبدیلی ضرور آئی تھی۔ اُس کے پاس اب صرف چار بھیڑیں تھی لیکن شہد کی مکھیوں کے سو(100) چھتّے تھے۔ اُس نے اپنی بھیڑوں کو بیچ دیا تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں بھیڑیں اُس کے نئے پودوں کو کھا نہ جائیں۔ میں نے غور سے دیکھا کہ عالمی جنگ سے اُس کے کام کاج پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اُس خطرناک لڑائی سے ایک دم بے خبر تھا اور لگاتار بیج بو رہا تھا اور درخت لگا رہا تھا۔

1910 میں لگے درخت اب اِتنے اونچے ہو گئے تھے کہ اُس کے سامنے ہم دونوں بونے لگ رہے تھے۔ ہرے لہلہاتے درختوں کا نظارہ دیکھنے کے قابل تھا۔ اِس غیر معمولی تبدیلی پر تبصرہ کرنا بھی میرے لئے ممکن نہیں۔ ہم سارا دِن خاموشی سے اِس ہرے بھرے جنگل میں گھومتے رہے۔ ہرے بھرے درختوں کی یہ وادی اب گیارہ کلومیٹر لمبی اور تین کلومیٹر چوڑی ہو گئی تھی۔ یہ اب کُچھ ایک غیر تربیت یافتہ گڈریئے کے دو ہاتھوں کی سخت محنت کا پھل تھا۔ اُس کی اِنسانیت اور دریادِلی دیکھ کر میرا دِل بھر آیا۔ مجھے لگا کہ اگر کوئی آدمی چاہے تو لڑائی اور تباہی کا راستہ چھوڑ کر، وہ بھی خدا کی طرح ایک پیاری اور خوبصورت دُنیا تخلیق کر سکتا ہے۔

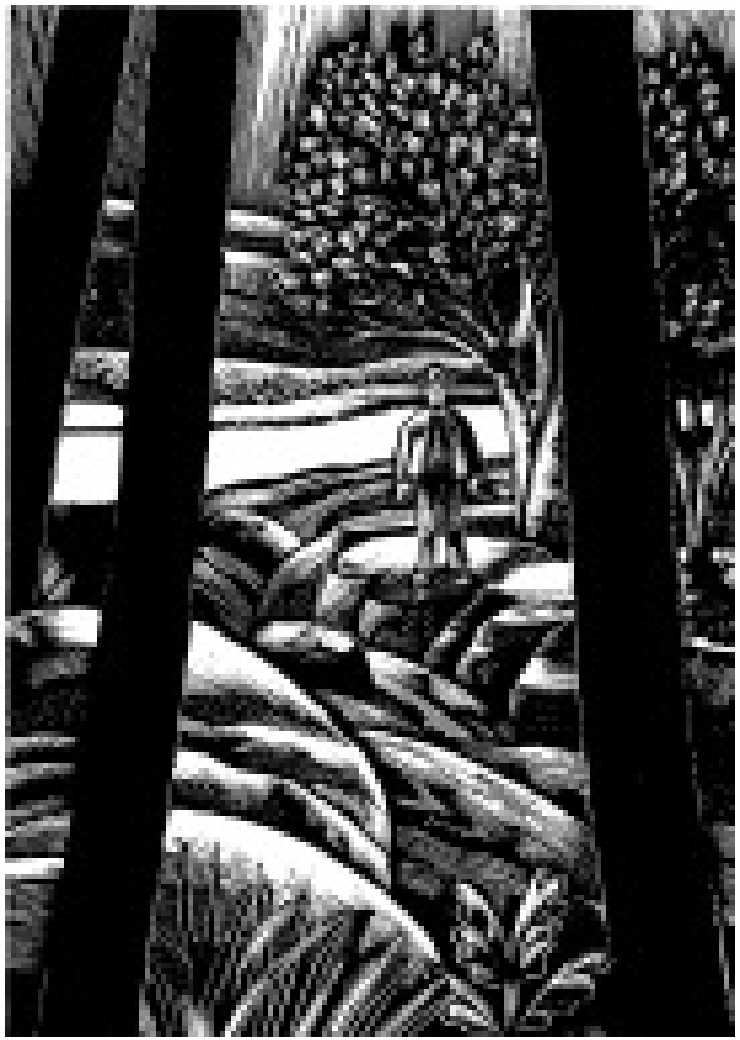

وہ دُنیا میں ہو رہی ہلچل سے ایک دم بے خبر اپنے خوابوں کو سچا کر رہا تھا۔ ہوا میں لہلہاتے چیڑ کے بے شمار درخت اِس بات کے گواہ تھے۔ اُس نے مجھے کچھ دیودار کے درخت دِکھائے جنہیں اُس نے پانچ سال پہلے لگایا تھا۔ اُس وقت میں فرنٹ پر لڑ رہا تھا۔ اُس نے اِن درختوں کو گھاٹی کے نیچے لگایا تھا۔ جہاں کی مٹی میں زیادہ نمی تھی۔ اِن درختوں کی جڑوں نے متی کو باندھے رکھا تھا۔ اُن کی چوڑی پتیاں چھتریوں کی طرح چھوپ کو روک رہی تھیں اور زمین کو تپنے سے بچا رہیں تھیں۔

اِس بنجر زمین میں درختوں کے لگانے سے ایک نئی جان آئی تھی۔ لیکن اُس کے پاس یہ سب دیکھنے کے لئے وقت ہی کہاں تھا۔ وہ اپنے کام میں اِتنا مصروف جو تھا۔ لیکن واپسی پر مجھے گاؤں کے پاس کچھ جھروکوں میں سے پانی کی کلکل سُنائی دی۔ یہ جھرنے نہ جانے کب سے سُوکھے پڑے تھے۔ درختوں کے لگنے کا یہ سب سے بڑا نتیجہ تھا۔ بہت سال پہلے اِن نالوں میں ضرور پانی بہتا ہو گا۔ جن کھنڈر ہوئے گاؤں کا ذکر میں نے پہلے کیا تھا، وہ شاید کبھی اِن نالوں کے کنارے ہی بسے ہوں گے۔

ہوا ابھی بیجوں کو دُور دُور تک پھیلا رہی تھی۔ پانی کے دوبارہ بہنے سے نالوں کے کناروں پر کئی طرح کے پودے اور گھاس اُگ آئی تھی۔ طرح طرح کے بیج جو مٹی کی چادر اوڑھے سو رہے تھے اب اپنی نیند سے جاگے تھے۔ جنگلی پھول اپنی رنگ برنگی آنکھوں سے آسمان کو تاک رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے زندگی جینے کا کوئی مطلب ہے۔ پر یہ سب بدل اِتنی سُست اور قدرتی رفتار سے ہوئی تھی کہ اُسے ماننے میں کوئی حیرانی نہیں ہوتی تھی۔ خرگوش اور جنگلی سُور کے شکاریون نے اِن درختوں کے سیلاب کو دیکھا ضرور تھا۔ لیکن اُنہوں نے اُسے زمین کی پید اور سمجھ کر بھلا دیا تھا۔ تبھی تو گڈریئے کے کام میں کسی نے کوئی دخل نہیں دیا تھا۔ اگر اُسے کیسی نے دیکھا ہوتا تو ضرور اُس کی مخالفت ہوتی۔ پر اُسے ڈھونڈنا بہت مشکل تھا۔ سرکار میں یا آس پاس کے گاؤں میں کبھی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ وسیع جنگل کسی نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔ اِس انوکھے اِنسان کی طبیعب کا اندازہ لگانے کے لیے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ وہ بالکل اکیلا تھا، اور ایک سُنسان علاقے میں اپنا کام کرتا تھا۔ اُس کے تنہا ماحول میں اِتنی خاموشی تھی کہ آخر میں وہ بولنا چالنا بھی بھول گیا۔ شاید یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کی زندگی میں اب الفاظ کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔

1933 میں پہلی بار ایک فاریسٹ رینجر بُھولا بھٹکا اُس تک پہنچا۔ رینجر نے اُسے اُس قانون بات سے شناسا کیا کہ جنگل کے آس پاس کسی طرح کی بیڑی سگریٹ یا آگ لگانے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ آتش گیر چیزوں سے اِس سرکاری جنگل کو خطرہ تھا۔ اِس رینجر نے اُس جنگل کو خود بخود اُگتے دیکھ کر حیرانی ظاہر کی تھی۔

اِس وقت وہ گڈریا اپنے گھر سے قریب 12 کلومیٹر کے فاصلے پر کچھ چیڑ کے درخت لگانے کی سوچ رہا تھا۔ اتنی دُور روز آنے جانے کی بجائے اُس نے اُسی مقام پر اپنا گھر بنانے کی سوچی۔ اگلے سال وہ نئے مکان میں چلا گیا۔

1935 میں اُس قدرتی جنگل کا معائنہ کرنے ایک بڑا سرکاری وفد بھی آیا۔ اُس میں محکمہ جنگلات یے تمام افسر شامل تھے۔ اُنہوں نے تمام بے مطلب کی باتیں کیں۔ اُن کی بے مطلب باتوں سے اور تو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ لیکن اِتنا ضرور ہوا کہ سارا جنگل " محفوظ جنگلی علاقہ " قرار دے دیا گیا۔ اُس کا ایک فائدہ یہ ہوا یہ لکڑی سے کوئلہ بنانے کے کاروبار پر پابندی لگ گئی۔ اِس جنگل کی خوبصورتی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا تھا۔ شاید اِس خوبصورتی کی وجہ سے ہی سرکاری افسروں کا دِل بھی پگھل گیا تھا۔

معائنہ کے لئے آئے وفد میں میرا ایک دوست بھی تھا۔ جب میں نے اُسے جنگل کا اصل راز بتایا تو وہ حیران رہ گیا۔ اگلے ہفتے ہم دونوں اُس گڈریئے کے پاس گئے۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ یہ جگہ معائنے والی جگہ سے تقریباً دس کلومیٹر دور تھی۔

وہ یوں ہی میرا دوست نہیں بنا تھا۔ وہ ایک اچھا انسان تھا اور بھلے کام کی عزت کرتا تھا۔ جو کھانا میں اپنے ساتھ لایا تھا اُسے ہم تینوں نے ایک ساتھ کھایا۔ اُس کے بعد ہم کئی گھنٹوں تک اُس خوبصورت جنگل کا نظارہ کرتے رہے۔ جس سمت سے ہم آئے تھے اُس پہاڑی کی ڈھلانوں پر لگے درخت 20،25 فٹ اونچے ہو چکے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ 1933 میں یہی زمین بالکل بنجر اور بے جان تھی۔ نفسیاتی سکون، سخت محنت، پہاڑوں کی صاف ہوا اور ایک سچی زندگی نے اُس گڈریئے کو عمدہ صحت بخشی تھی۔ اِس زمین پر شاید وہ خدا کا برگزیدہ

بندہ تھا۔ میں بس یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کتنی ساری زمین پر اور درخت لگائے گا۔ جانے سے پہلے میرے دوست نے مٹی کو جانچ کر کچھ خاص قسم کے درخت لگانے کا مشورہ دیا۔

لیکن اُس نے اپنے اِس مشورے پر بہت زور نہیں دیا۔ بعد میں اُس نے مجھ سے کہا۔' میرے زور نہ دینے کے پیچھے ایک معقول وجہ ہے۔ وہ گڈریا درختوں کے بارے میں مجھ سے کہیں زیادہ جانتا ہے۔' کوئی گھنٹا بھر چلنے کے بعد میرے افسر دوست نے مجھے سے پھر کہا،' وہ آدمی شاید درختوں کے بارے میں دُنیا میں سب سے زیادہ جانتا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اُس نے خوش رہنے کا ایک انوکھا طریقہ تلاش کیا ہے۔'

اُس افسر کی بدولت ہی جنگل محفوظ رہ سکا اور ساتھ ہی گڈریئے کی خوشی بھی۔ اُس افسر نے جنگل کی حفاظت کے لئے تین رینجر تعینات کیے۔ اُن پر سخت نگرانی رکھی گئی کہ جس سے یہ کوئلہ بنانے والوں کی طرف سے دی گئی شراب کی بوتلوں جیسی رشوت سے بچے رہیں۔

1934 میں حفاظت کے اِس کام میں رُکاوٹ پیدا ہوئی۔ ریل کی لائن بچھانے کے لیے لکڑی کے سلیپروں کی بڑی تعداد میں ضرورت پڑی۔ اُس وجہ سے درختوں کی اندھادُھند کٹائی شروع ہوئی۔ لیکن یہ علاقہ ریل سٹیشن یا پکی سڑک کی پہنچ سے اِتنا دُور تھا کہ لٹھوں کو لاد کر لے جانے کا کام بہت مہنگا ثابت ہوا۔

اِسی وجہ سے جنگل کاٹنا بند کر دیا گیا۔ گڈریئے کو اِس پورے واقع کی کوئی خبر نہ تھی۔ وہ لگ بھگ 30 کلو میٹر کی دُوری پر، اطمینان سے درخت لگانے کے کام میں مصروف تھا۔ دوسری عالمی جنگ کو بھی اُس نے اِسی طرح نظر انداز کیا تھا۔

جُون 1945 میں مجھے اُس بوڑھے گڈریئے سے آخری بار ملنے کا موقع ملا۔ اُس وقت اُس کی عمر تقریباً چھیاسی سال کی ہو گئی تھی۔ اِس دوران وہاں کافی تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ اِس بیابان سڑک پر جب میں نے بس کو چلتے دیکھا تو مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں کئی جانی پہچانی جگہوں کو پہچان بھی نہ سکا۔ بس مجھے کئی نئے علاقوں سے گھماتی ہوئی لے گئی۔

جب میں نے ایک بورڈ پر اُس پُرانے گاؤں کا نام لکھا دیکھا تبھی مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ یہ تو وہی گاؤں ہے جو ایک وقت میں کھنڈر ہو گیا تھا۔

میں بس سے اُتر کر گاؤں کی طرف پیدل ہی چلا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ 1913 میں اُس گاؤن کے 12، 10 ٹُوٹے پُھوٹے مکانوں میں صرف تین لوگ رہتے تھے۔ گرمی اور غریبی کی وجہ سے وہ بے حال تھے۔ اُن کی حالت آدم کے زمانے کے وحشیوں جیسی تھی۔ اُن کے آس پاس کے گھروں میں کانٹے دار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اُس نااُمید زندگی سے صرف موت ہی اُنہیں نجات دِلا سکتی تھی۔

پر اب سب کچھ بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ ہوا میں اچھی خوشبو تھی۔ مگر لُو کے تھپیڑوں کی بجائے اب ہوا میں کچھ نمی تھی۔ ایک طرف مجھے پانی کے گرنے کی آواز سُنائی دی۔ میری حیرانی کی کوئی حد نہیں رہی تھی۔ جب میں نے پایا کہ وہاں ایک چھوٹے تالاب میں فوارہ چل رہا تھا۔ اُس کے پاس ہی کسی نے کنک چمپا کا ایک خوبصورت درخت لگا رکھا تھا۔ درخت تقریباً چار سال پُرانا ہو گا۔ چمپا کا درخت اِس بات کی علامت تھی کہ اِس جان لیوا ریگستان میں اب دوبارہ زندگی لوٹ آئی تھی۔

گاؤں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہاں کے لوگوں کا ایک روشن مستقبل کا یقین جاگا ہے۔ اُن میں ایک نئی اُمید جاگی ہے۔ کھنڈروں کو ہٹا کر پانچوں گھروں کی مرمت کر پُختہ بنایا گیا تھا۔ گاؤں میں اب 28 لوگ رہتے تھے جن میں "چار" خاندان بھی شامل تھا۔ نئے گھروں کو حال ہی میں مرمت کیا گیا تھا اور سامنے کیاریوں میں ہری سبزیاں، پھل اور پُھول اُگ رہے تھے۔ کہیں پر گلاب اور گیندے کے پُھول تھے تو کہیں پر لوکی اور سیم کی بیل تھی۔ وہ اب ایسا گاؤں بن گیا تھا جہاں ہر ایک کے رہنے اوور بسنے کا دِل کرے۔

عالمی جنگ ختم ہی ہوئی تھی اور اِس وجہ سے رہن سہن پوری طرح سے معمول پر نہیں آیا تھا۔ پہاڑی کے نچلی ڈھلان پر میں نے جو اور باجرے کے کھیت دیکھے۔ تنگ گھاٹی میں جہاں نمی زیادہ تھی وہاں اب ہریالی اُگ آئی تھی۔

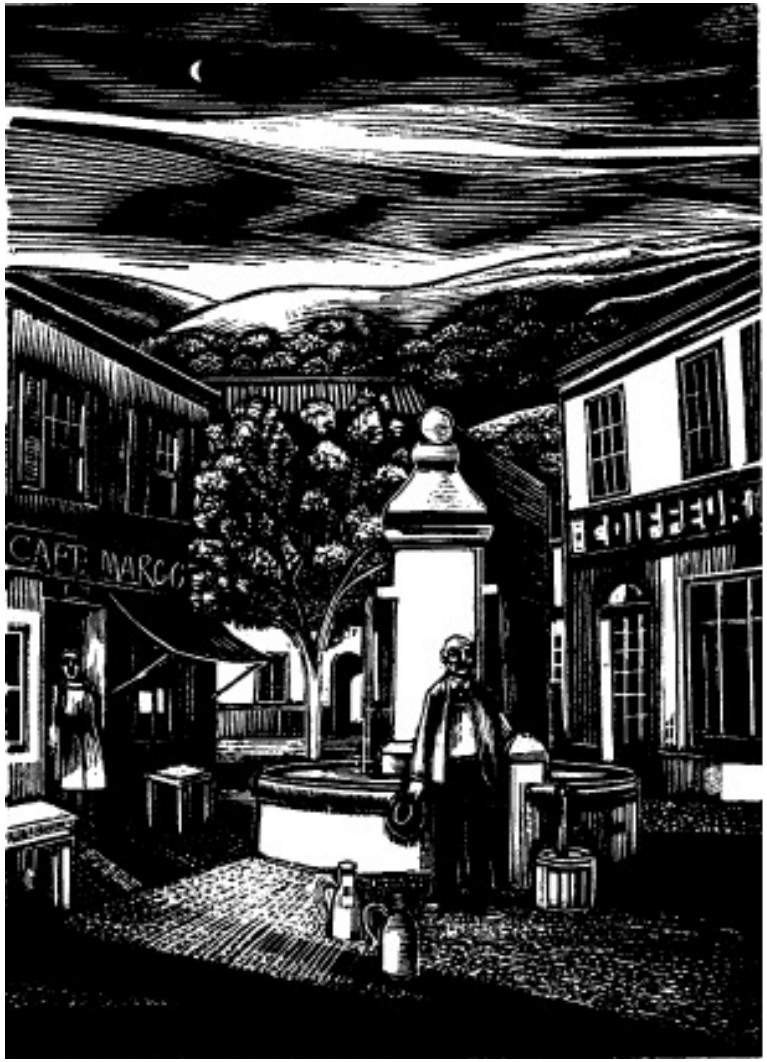

صرف آٹھ سالوں میں ہی یہ علاقہ ہر بھرا اور خوشحال ہو گیا تھا۔ 1913 میں مجھے جہاں کھنڈر دِکھے تھے وہاں اب ہرے بھرے کھیت تھے۔ لوگ بھی خوش اور سکھی دکھائی دیتے تھے۔ پہاڑی نالے جو پہلے سُوکھ گئے تھے اب اُن میں دوبار پگھلی برف کا شفاف پانی بہنے لگا تھا۔ اس پانی کو نالیوں کے ذریعے الگ الگ کھیتون میں کے جایا جا رہا تھا۔ کھیتوں کے پاس درختوں کے سایہ دار جُھنڈ تھے۔

رفتہ رفتہ پورا گاؤں دوبارہ آباد ہو گیا تھا۔ میدانی علاقوں میں زمین کی قیمت مہنگی تھی۔ وہاں سے لوگ آ کر یہاں پر بس گئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ نئی تاریخ اور اُمنگ لائے تھے۔ سڑکوں پر آپ ایسے لوگوں کو دیکھ سکتے تھے جن کے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ اگر یہاں کی پوری آبادی کو گنا جائے تو اِتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اِن دو ہزار لوگوں کی خوشحالی کا ذمہ دار وہ انپڑھ گڈریا تھا۔

جب میں سوچتا ہوں کہ یہ سب خوشحالی ایک اکیلے آدمی کے دِل اور ہاتھوں سے پورا ہوا ہے تو میں احترام سے سر جُھکا دیتا ہوں۔ ایک عام سے اِنسان نے اکیلے ہی اُس بنجر زمین کو آباد کیا تھا۔ جب میں یہ سوچتا ہوں تو تمام مشکلوں کے باوجود اِنسانیت پر میرا یقین اور بڑھ جاتا ہے۔ اُس انپڑھ عظیم روح کی زندگی سے میں نے صرف 50

یک ہی سبق سیکھا ہے کہ اگر اِنسان چاہے تو زمین پر رہ کر وہ بھی خدائی احسانات کر سکتا ہے۔ 1947 میں ایک درخت کے نیچے اِس گڈریئے کی آنکھیں سدا کے لیے بند ہو گئیں